ناول" دستک نہ دو "کے کرداروں کا ناسٹلجیائی المیہ

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی[1]، ڈاکٹر نذر عابد**

Abstract:

"Altaf Fatma's name in modern Urdu literary tradition is synonymous with experimentation with narrative structure and plot. Her novel, 'DASTAK NAA DO", won great acclaim owing to its theme and stylistic structure. The novel is a case study of nostalgic character of safdar leuchio's love towards its home land China. He feels home sickness and love to revert in glorious fantasy period of the life. In this article both the writers psychologically analyze the past loving behavior of DASTAK NAA DO's characters in the light of Nostalgia."

یہ بات انسان کی جبلت کا خاصا ہے کہ اسے ہمیشہ اپنے ماضی میں شدید کشش محسوس ہوتی ہے۔وہ اپنے حال سے عام طور پر غیر مطمئن ہوتا ہے اور مستقبل سے ایک انجانا خوف لاحق ہوتا ہے۔نتیجے کے طور پر وہ اپنے ماضی میں نفسیاتی اور روحانی حوالوں سے پناہ گزیں ہونے کی کوشش کرتا ہے۔خاص طور پر پیرانہ سالی میں جوانی کی رنگینیاں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور انسان ان خوش کن یادوں میں ہر وقت کھوئے رہنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔علم نفسیات کی رو سے اس کیفیت کو ناسٹیلجیا کہا جاتا ہے۔ علی عباس جلال پوری اس کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں :

> ''عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ پیران کہن سال اپنی جوانی کے زمانے کو بڑی حسرت سے یاد کرتے ہیں اور حال کی تلخیوں سے نجات پانے کے لیے ماضی کے رنگین افسانے سناتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حال میں ان کے لیے کشش باقی نہیں رہتی ، گونا گوں امراض کا غلبہ ہوتا ہے ۔ تنہائی کا شدید احساس دامن گیر رہتا ہے ۔ بیٹے پوتے ان کے لیے بے پناہ نصیحتوں سے دور بھاگتے ہیں۔مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے اس لیے وہ ماضی کے سنہرے دھند لکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔'' (۱)

ہجرت کے کرب سے گزر کر دیار غیر اپنی بستیاں بسانے والوں کی ذات میں ناسٹیلجیا کی یہ کیفیت شدید تر ہو جاتی ہے۔اس کے لیے کہن سالی کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ دیار غیر میں قدم رکھتے ہی اس حالت و کیفیت کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ پردیس جا بسنے والے عمومی طور پر مختلف قسم کے سماجی ،معاشی،روحانی اور نفسیاتی دکھوں کا شکار رہتے ہیں۔ہر ہر قدم پر انھیں اپنے وطن کی یاد ستاتی ہے،اپنی جان سے عزیز والدین ،بہن بھائی،رشتے دار اور پیارے دوست احباب کی محبت بھری یادیں ہر لمحہ دل کو اداس کرتی رہتی ہیں۔ الطاف فاطمہ کا ناول ''دستک نہ دو'' بھی ایک تارکِ وطن کی کہانی ہےجو ماضی پرستی اور ماضی گیری میں گھرا ہوا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار چین کا صفدر لیو چیو ہے جو کراچی جیسے بڑے تجارتی اور صنعتی شہر میں روزگار کے لیے آیا ہے۔اسے ہر وقت اپنے عزیز وطن اوراپنی مادر مہربان کی یاد ستاتی رہتی ہے۔

صفدر کراچی میں ایک شوز سٹور پر محنت مزدوری کرتا ہے اس کے علاوہ اپنے بائیسکل پر چینی مصنوعات کوچہ بہ کوچہ فروخت کرتا ہے ۔ ایک دن جب وہ حسب معمول بڑے بڑے بنگلوں کے ایک علاقے میں اپنا مال فروخت کرنے نکلا تو اس دن کی سہانی رت سے متاثر ہو کروہ ماضی کی

---

[1]ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، ہزارہ یونی ورسٹی ،مانسہرہ
** صدر شعبہ ٔ اردو ، ہزارہ یونی ورسٹی ،مانسہرہ

یادوں میں گم ہو جاتا ہے:

''پھر خود بہ خودہی وہ خوشی کے نغمے کی دھن اداس سروں میں بدلتی چلی گئی ۔ اس نے ٹھنڈی سی سانس لی اور ناتمام دھن کو فضا ہی میں بھٹکتا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اس کو چلتے چلتے گھر کی یاد آگئی۔ اس نے دھند اور کہر سے چھپے ہوئے افق کو تاکتے ہوئے سوچا کیا پتہ آج پیکنگ میں بھی ایسے ہی غضب کی سردی ہواور نہ جانے، نہ جانے میری ماں کیا کر رہی ہوگی۔ دُبلے جسم ، چپٹے اور خوبصورت دہانے والی عورت جس کے ہاتھ محنت کرنے کے باوجود نرم اور کنول کی طرح نازک ہیں اور میری دونوں چھوٹی بہنیں ! معلوم نہیں سکول جاتی ہیں یا نہیں۔ سوچوں کا سلسلہ طویل ہوتا ہے۔ وہ گھر والوں کے متعلق سوچتے سوچتے جھینگوں کے شوربے ، سرکے میں کتری ہوئی ہری مرچوں کی چٹنی اور گاجر کے لچھے کے ساتھ پکی ہوئی مچھلی کے متعلق سوچنے لگا۔ جو یہ چیزیں اس کو ڈھنگ سے ٹھکانے سے ملتیں تو وہ اسکول چھوڑ کر اتنی کم عمری میں گھر سے بے گھر اس پرائے دیس میں سڑکیں کیوں ناپتا پھرتا۔''(۲)

انسانی فطرت ہے کہ دیارِ غیر میں اپنے پیاروں سے متعلق کسی بھی معمولی سے معمولی چیز کو بھی وہ حرزِ جاں بناکر رکھتا ہے ۔اسی فطری مجبوری کے تحت صفدر لیو چو بھی وطن سے موصولہ اپنی ماں کے ہاتھ سے لکھے ہوئے خط کو سینت سینت کے رکھتا ہے۔بار بار اُسے پڑھتا ہے ،اُسے محسوس کرتا ہے اور پھر ناسٹلجیائی کیفیت کے تحت اُس کی اُداس آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے:

"اس کی عمر ہی کیا تھی ابھی دسمبر میں تو وہ پورے سترہ سال کا ہوا تھا اور عین اس دن اس کو ماں کا خط ملا تھا۔ جو اس نے آج تک اپنے دل کے قریب والی جیب میں رکھ چھوڑا تھا۔ اتنی مشاقی سے برش عام طور پر مرد ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کی ماں کے لڑکپن میں عورتوں کی تعلیم کب اتنی عام تھی پر وہ تو دینی مدرسے کے اس معلم کی بیٹی تھی جس کے قلم کی جنبشیں مشہور تھیں۔

وہ اس خط کو بڑے پیار سے نکال کر دیکھتا اوپر تلے لکھے ہوئے حروف کو پیار کرتا اور پھر تہہ کرکے احتیاط سے رکھ لیتا ۔ چین میں عام طور پر لڑکوں کی مائیں کب اتنے بے عیب حرف بناتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی آجاتی او سر فخر سے تن جاتا ۔''(۳)

اپنے وطن سے دور پردیس میں صفدر کا کل جہان مادر وطن اور اپنی مادر مہربان کی شفقت بھری یادوں ہی پر مشتمل تھا۔ اگرچہ اپنے وطن میں اسے عسرت بھری حیات کی تنگی اور معاشی بدحالی کے سوا حاصل ہی کیا تھا لیکن اب دیار غیر میں یہ تمام تر سختیاں اسے آسودگیوں کی صورت دکھائی دیتی تھیں۔

صفدرکو اپنے وطن سے بے انتہا اور بے حد محبت تھی ۔وہ اپنی تنگ دستی اور عسرت زدہ زندگی سے گویا محبت کرتا تھا ۔وہ غریبی اور معاشی تنگی کے باوجود غیرت اور خودداری کے عظیم جذبوں سے معمور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے بنگلوں میں رہنے والی نخریلی بیگمات جب اس کے وطن کی بنی ہوئی اشیاء کو اس کے سامنے حقارت کی نظر سے دیکھتیں یا ان میں کچھ مین میخ نکالتیں تو اسے بہت برا لگتا تھا۔

اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں سے بنی ان اشیاء سے اسے اپنی مٹی کی خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ اس خوشبو میں اس قدر مست الست ہو جاتا کہ جیسے وہ اپنے پیارے دیس کے گلی کوچوں میں کہیں کھویا ہوا ہو:

''اور جب وہ اپنا گٹھڑ دوبارہ سائیکل پر لادتا تو یہ سوچ کر اس کا دل کڑھ کر رہ جاتا کہ یہ بیگم لوگ اس کی چیزوں کو معمولی اور نکما بتاتی ہیں ان کو کیا معلوم یہ چیزیں اس کے نزدیک کتنی پیاری اور بے بہا ہیں۔ یہ اس کے ملک کی فاقہ کش عورت کی دستکاری ہے۔ جن کو سخت محنت اور دیدہ ریزی کے بعد بھی شکم سیری نصیب نہیں ہوتی۔ کپڑے اور ریشم سے بنائے ہوئے ان

شگوفوں ، پائلوں ، دریاؤں ، کشتیوں اور معبدوں سے اس کو کتنا جذباتی لگاؤ ہے وہ کیا جانیں وہ جب ان سب چیزوں کو بکھیر کر ان کے درمیان بیٹھتا تو اس کو محسو س ہوتا کہ قدیم اور مہذب چین کا سارا ماحول ، کلچر اور تاریخ اس کے ارد گرد بکھری ہوئی ہے اور خود وہ ان سب کے درمیان مقدس بدھ کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۴)

صفدر لیو چو نے انتہائی کسمپرسی ،لاچارگی اور کم عمری میں اپنا وطن مالوف چھوڑا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے دل اور دماغ پر ہمہ وقت نادر وطن کی یادیں شبنم بن کر برستی رہتی تھیں۔ پرائے دیس میں اسے مسلسل اور سخت محنت و مشقت سے گزرنا پڑتا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ بدیسی لوگوں کے رویے بھی ناقابل برداشت تھے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اس کے وطن کی خوب صورت یادیں ہی اس کی روح اور دل کے زخموں کے لیے مرہم آسودگی کا کام کرتی تھیں۔اپنے وطن سے مماثلت رکھنے والا کوئی بھی منظر اس کی یادوں کو مہمیز لگا دیتا تھا:

''سلک کے نیلے چار خانے کے شب خوابی کے لباس میں وہ اور بھی چینی نظر آرہی تھی۔ صفدر کو گھر کی یاد پھر ستانے لگی اور اس کا دل بلاوجہ ہی غمگین ہونے لگا۔''(۵)

ناول کی ہیروئن گیتی آرا بیگم ایک اعلی گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ اس کی ایک قریبی رشتے دار خاتون ایک دن اپنے مرحوم ومغفور شوہر نامدار کی یادوں کے ورق کھولنے لگتی ہے۔ اس ناسٹلجیائی کیفیت میں محو ہوکر وہ گزرے زمانے کے دکھ رونے لگتی ہے کہ وہ کیسا روشن، تابناک اور خوش حالی و آسودگی کا زمانہ تھا۔

''ارے ! تو وہ مرنے والا ہی کب کسی بات میں دخل دیتا تھا۔ وہ تو کہو عمر نے وفا نہ کی، ہمارے تو لڑکوں میں عادت ہی نہیں۔ خدا بخشے تمہارے اباجان ہمارے سیاہ سفید میں دخل دیا۔ وہ سر جھکائے فیروزی دوپٹہ کے کناروں پر سنہری کرن ٹانکتی رہیں۔ ان کو وہ مختصر لیکن آسودہ ساتھ یاد آگیا تھا۔''(۶)

صفدر لیو چو کو گیتی آرا بیگم سے ایک قلبی تعلق تھا۔ وہ اپنا آپ اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا تھا۔ گیتی آرا بیگم کے نین نقش عام چینیوں سے مماثلت رکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صفدرکو اس خاتون کی شکل و صورت اور اس سے متعلق ہر شے سے ایک خاص قلبی لگاو ٹ تھی۔ وہ جب کبھی گیتی کے گھر کی طرف آتا تو اسے اپنے وطن کی یادیں اپنے حصار میں لے لیتیں:

''اور خود اس کا گھر پیکنگ کی تنگ و تاریک گلیوں میں تھا۔ جس کا صحن مختصر اور کمرے محدود تھے۔ اس مختصر سے گھر میں ویشاؤں کا گذر نہ تھا۔ قدیم مذہبی طرز کے مدرسے کا دبلا پتلا معلم ان عیاشیوں کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے گھر میں فراغت و خوش حالی کبھی مہمان بن کر بھی نہ آتی تھی۔ اس عظیم طبقاتی فرق کے باوجود صفدر لیو چیو کو گیتی کے گھر کے پھاٹک کو دیکھتے ہی محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اپنے گھر کے قریب آگیا ہو اور اب وہاں گئے بنا واپسی ناممکن ہے۔''(۷)

صفدر لیو چو جب پاکستان میں طبقاتی تضادات کا تجزیہ کرتا اور اس ملک کے حالات کا تقابل اپنے ملک کے معروضی حالات سے کرتا تو وہ گویا اپنے آپ کو اپنے وطن میں پاتا۔ یوں اسے یک گونہ اطمینان میسر آتا کہ جیسے وہ اپنے ملک کی فضا ہی میں سانس لے رہا ہے۔ تاہم مانوسیت بھرا یہ ماحول اسے ناسٹیلجیائی کیفیت سے دوچار کر دیتا تھا۔

''گھر والوں اور گھر کے خیال کے ساتھ ہی وطن کی تاریک گلیوں اور فاقہ کش انسانوں کا خیال آتا اور یہاں پر دیس میں چاروں طرف بکھری ہوئی ویسی ہی پریشان اور اُفتاں و خیزاں زندگی کو دیکھ کر وہ سوچتا۔

ارے ! میں کب یہاں پر تنہا اور اجنبی ہوں یہ تو وہی آشنا ماحول اور جانی پہچانی زندگی ہے۔ یہاں بھی غربت، فاقہ کشی اور بیماری ہے۔

یہاں بھی انسانوں کے تن ننگے، دل حسرتوں کے مزار ہیں۔ یہاں بھی لوگوں کی عمروں کے کئی کئی سال من بھاتا کھانے اور جگ بھاتا پہننے کی آرزو میں کٹ جاتے ہیں۔ یہاں بھی تنگ اور

افسردہ گلیوں سے دور ایک اور زندگی ہے۔ اونچے مقتدر طبقے کی ۔ جہاں زندگی کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ ضروریات وہاں موہوم آرزو اور تمنا بن کر نہیں حقیقت کا روپ دھار کر آتی ہیں۔ جہاں بچے حال اور مستقبل کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں۔اور لڑکیاں چڑیوں کی طرح بے فکر اور خو ش باش ہوتی ہے بالکل کوکو کی طرح۔''(۸)

صفدر لیو چو جب پاکستان اور چین کی معاشرت اور معیشت کا تقابل کرتا ہے تو ایسے میں وہ دراصل زمینی ناسٹیلجیا کی گرفت میں ہوتا ہے۔ وہ جس سماجی طبقے سے تعلق رکھتا ہے، پاکستان میں بسنے والے اسی طبقے کے سماجی و اقتصادی حالات پر نظر کرتا ہے تو اسے حیرت انگیز مماثلتیں دکھائی دیتی ہیں ۔تنگ و تاریک گلی کوچوں میں اپنے بنیادی حقوق کو ترستی مخلوق کی ناآسودہ خواہشات کو وہ خود بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔یہ تمام صورتیں زمینی ناسٹیلجیا سے متعلق ہیں ۔دوسری طرف جب وہ اپنے وطن میں گزری زندگی اور اب پردیس میں گزرتے شب و روز کا موازنہ کرتا ہے تو ایسے میں وہ زمانی ناسٹیلجیا کا شکار نظر آتا ہے۔ صفدر گیتی آراکو اس کے اصل نام کی بجائے کوکو جیسے پیار بھرے نام سے پکارتا ہے۔وہ اکثر اس خاتون اور اپنے وطن کے بارے میں بیک وقت سوچتا رہتا ہے،گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے تلازمہ خیال ثابت ہوتے ہیں:

''صفدر نے ایک انگڑائی کے ساتھ نیم وا آنکھوں کو بالکل بند کرتے ہوئے سوچا: وہ بھی تو ان دنوں اپنے باپ کے قدیمی گھر میں چھٹیاں گزار رہی ہے۔ پتہ نہیں کیسا ہوگا وہ گھر '' فاہیاں اور میگسیتھنز کے دیس کے نو عمر اور گمنام نمائندے صفدر یاسین لیو چیو کو بے وجہ تجسس ہوا۔ کیا وہاں بھی لکڑی کے منقش بھاری دراوزے ہوں گے کیا وہ گھر بھی مختلف ڈیوڑیوں اور انگنائیوں میں بٹا ہوگا۔ کیا وہ لوگ بھی اپنے رشتے کنبے کے لوگوں کی پرورش کرتے ہیں۔ پر ان کے یہاں کی ساری عورتیں کو کو جیسے نہیں ہوتیں جو چینیوں سے خطرناک حد تک مشابہہ ہے۔''(۹)

صفدر لیو چو غریب الوطن بھی ہے اور محنت و مشقت کرنے والا مزدور بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک تخلیق کار اور فن کار بھی ہے۔اسے مصوری سے بہت زیادہ شغف ہے۔مصور ہوتے ہوئے وہ تیز مشاہدے اور گہرےتخیل کا مالک ہے۔ جب وہ مختلف قسم کی ناسٹیلجیائی کیفیات کا سامنا کرتا ہے تو اس کا تخیل بہت متحرک ہو جاتا ہے اور اس کے ہاں خیال کی سطح پر اس کے اپنے وطن کے زمینی اور ثقافتی مناظر ابھرنے لگتے ہیں۔ وہ خیال کی سطح پر ابھرتے ان مناظر و مظاہر سے قلبی و روحانی طور پر لطف اندوز ہوتا ہے:

''سانگ چین جا رہا ہے۔ کئی سال بعد وہ اور اس کی داشتہ دونوں وطن جا رہے تھے۔ وہ وطن کی پیاری خوشیوں اور فضا میں سانس لیں گے۔ وہاں کی تمام خوشیوں اور دکھوں کو زندہ اور محسوس طور پر دیکھیں گے۔ کاش میں بھی وہاں جا سکتا۔ اگلے مہینے میری بہن کی شادی ہے۔ دور دراز گاؤں سے اس کی سسرال والے کپڑوں اور سازو سامان کے ساتھ ایک ڈانڈی اس کےلیےبھیجیں گے۔ اور وہ اس میں بیٹھ کر اس دیس چلی جائے گی۔ جہاں اس کا ہونے والا شوہر دھان کے کھیتوں میں کام کر رہا ہوگا۔ اس کے سر پر دھان کے ریشے سا بنا ٹوپ ہوگا۔ اور تن پر نیلا کوٹ اور پاجامہ ۔ ٹھیک ہے۔ یوں ہی ہوتا ہے ۔عالموں کی یتیم لڑکیاں جاہل کسانوں کو سونپ دی جاتی ہیں۔ اور ----- اور ------- خیر کچھ نہیں۔''(۱۰)

صفدر کی یہ ناسٹیلجیائی کیفیات محض انفعالی حیثیت کی حامل نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کے متعلق بھی سوچتا ہے۔ مختلف سماجی رشتوں ناتوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کبھی ایک فرض شناس بیٹے اور کبھی ایک ذمہ دار اور محبت کرنے والے بھائی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔وہ اپنی ان سماجی ذمہ داریوں کو سوچتے ہوئے اداس بھی ہو جاتا ہے کہ عملی طور پر تو وہ اس تمام صورت حال سے کوسوں دور غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔اس اداسی کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ان پیاروں سے دور ہے بلکہ اپنی ذمہ داریوں کے نبھانے کے مواقع بھی اسے میسر نہیں ہیں :

''مجھے تو فکر یہ ہے کہ نسبت اور شادی کی رسوم میری غیر حاضری میں کس طرح طے ہوئی ہوں گی۔
صفدر یاسین نے سانگ کے کھاتے میں رقمیں لکھتے لکھتے ہاتھ روک لیا اور زمین پر پڑا ہوا خوب صورت حروف اور برش کی مشاق اور محتاط جنبشوں میں مختصرخط، اس کی ماں نے اپنے گھر کی پہلی شادی کی اطلاع اپنے اس کماؤ پوت کو دی تھی جو اس سے منزلوں اور میلوں دور تھا۔ پردیس میں بیٹھے ہوئے لڑکے پر اس نے اپنی پریشانیوں اور فکروں کا کوئی اظہار نہ کیا تھا۔ لیکن چند قانع الفاظ اور سنجیدہ سطریں اس کی دلی کیفیت کی ترجمان تھیں۔
اچھا بیٹا ! تم رنج نہ کرنا۔ تم جہاں کہیں بھی رہو ۔ ہم تم کو اپنے آپ سے بالکل قریب ہی سمجھتے ہیں۔ تم ہماری ہی خاطر اتنی دور جا بیٹھے ہو تم اپنی بہن کی خوشحالی کی دعا کرنا ۔ تم کوئی غم نہ کرنا۔
نہیں ماں میں غم نہیں کروں گا۔ میں خوش ہوں کہ میرے باپ کی بیٹی کسی سود خور مہاجن یاراشی افسر کی بیوی نہیں بننے والی ہے۔جس کےرگ و ریشے میں محنت کی حلال اور محتاط کمائی کا خون دوڑ رہا ہے۔ وہ ظلم اور زیادتی کی ناروا راحتوں سے محفوظ رہے گی۔ ماں! تم بھی شکر کرو کہ وہ کسان کے گھر جا رہی ہے۔ کسان تو جگ کا پالن ہار ہوتا ہے۔''(۱۱)

حب الوطنی انسان کی جبلت کا حصہ ہے۔وطن سےدوری کے زمانے میں انسانی فطرت کا یہ تقاضا مزید ابھرکر سامنے آتا ہے۔اور بقول شاعر یہ کیفیت ہو جاتی ہے:

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاوں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

تاہم یہ بات طے ہے کہ وطن صرف پہاڑوں اور دریاوں کا نام نہیں وطن دراصل وطن میں بسنے والے پیارے لوگوں سے عبارت ہے۔حب وطن کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے لوگوں سے محبت کی جائے ان کے دکھ درد کو محسوس کیا جائے خاص طور پر ان انسانوں کے لیے جن سے خونی رشتے ناتے ہوتے ہیں ۔صفدر ایک ایسا محب وطن انسان ہے جو ایسے خونی رشتوں سے دوری کی بنا پر انھیں شدت سے یاد کرتے ہوئے خون کے آنسو روتا ہے۔وہ اپنی مٹی کے لیے بھی تڑپتا ہے اور اپنے پیاروں کے لیے بھی اشک بہاتا ہے:

''میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ میں تو ایک غریب جاہل چینی ہوں جو سات سال سے اپنے وطن نہیں گیا ہے۔ میں نے سات سال سے اپنی ماں کو نہیں دیکھا۔ جس کے پاس سوئے بغیر مجھے آتے دم تک نیند نہ آتی تھی۔ مجھے اپنی ماں کے جسم ، اپنے وطن کی زرد مٹی اور دھان کے کھیتوں کی مخصوص بو کی یاد ہر روز ستاتی ہے۔''(۱۲)

ناول کی ہیروئن کو جب محبت میں ناکامی کے دن دیکھنے پڑتے ہیں تو وہ اپنے دکھوں سے فراری کیفیت کے زیر اثر اپنے شہر کے ایک دور دراز کالج میں ایڈمشن لے لیتی ہے اور گھر بار چھوڑ کر کالج کے ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لیتی ہے۔ ایک روز سینما جاتے ہوئے وہ کالج کے ہاسٹل سے باہر نکلتی ہے تو صفدر لیوچیو سے اس کا آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔صفدر کو دیکھتے ہی اسے اپنے گھر کی یاد ستانے لگتی ہے اور وہ خود کو ایک ناسٹیلجیائی کیفیت میں مبتلا پاتی ہے:

''لیوچو کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے خوشی سی ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اسے یوں پاس کھڑا دیکھ کر گھر کے قرب کا احساس ہو رہا تھا۔ اس پردیسی انسان کو دیکھتے ہی اس کو اپنے گھر کا برآمدہ، باغ اور وہ مخصوص دیوار جس پر ایک ٹانگ ادھر ایک اُدھر ڈال کر وہ بیٹھا کرتی تھی۔ اسے سب کچھ یاد آگیا۔ آج وہ یوں ہی صبح سے ہوم سک ہو رہی تھی اور اب اس کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ وہیں پہنچ گئی ہو۔ اماں بیگم اپنے کمرے میں تختوں پر ظہر کی نماز پڑھ رہی ہیں ۔ ارجمند سو رہی ہے اور بیرا کھانے کے کمرے میں شام کی چائے کے لئے برتن کھڑکھڑا رہا ہے۔ جیسے وہ کسی سے خفا نہ ہو۔ اس کا کسی سے بھی بگاڑ نہ ہو۔''(۱۳)

گیتی آرا بیگم کے والد جہانگیر مرزا ایک روز اپنے گھر کے باغیچے میں بیٹھے تھے۔ان کی

سوچوں پر گزرے دنوں کی یادوں کی ایک یلغار تھی جو انھیں اداس کیے جا رہی تھی ۔ایسے میں وہ خاص طور پر اپنی ماں کی یادوں میں گم سے ہو گئے اور وہ موت کی سفاکیت کے بارے میں سوچتے ہوئے مزید اداس ہوتے چلے گئے:

''بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ ماں جس کے متعلق بارہا میں نے سوچا تھا۔ وہ ہمارے فرائض سے فارغ ہو چکی ہے۔ اور جس کی ضرورت اب زندگی میں حقیقتاً بہت کم محسوس ہوتی تھی۔ دنیا سے اٹھ گئی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اب ہی تو مجھے اس کی ضرورت تھی۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ زندگی میں اتنی موتوں کا سامنا ہوا اور اتنے عزیز بچھڑ گئے مگر موت نے یہ احساس نہ دلایا تھا کہ زندگی کے سوتے خشک ہو گئے۔ یوں کبھی نہ معلوم ہوا تھا کہ زندگی کی ہری بھری کھیتی کے قریب چھل بھل کرتی شفاف نہر سوکھ گئی ہے۔ اور اماں جان تم نے تو اس وقت مر کر واقعی مجھ پر ظلم کیا ہے۔ میں ان دنوں کتنا دکھی ہو رہا تھا اور کتنے دنوں سے سوچ رہا تھا ایک چھٹی لے کر تمہارے پاس بالکل اکیلا جاؤں اور تمہارے قریب لیٹ کر سکون حاصل کروں گا۔ اور وہ بہت سی باتیں جن کو سن کر سچے دل سے صرف ایک ماں کا ہی دل کڑھ سکتا ہے۔ تمہارے سامنے بیٹھ کر کروں گا۔ تمہیں اپنے لیے کڑھتا دیکھ کرمیرے زخم مندمل ہو جاتے۔''(۱۴)

ناول میں ایک مقام پر شدید ناسٹیلجک صورت حال اس وقت پیدا ہو جاتی ہےجب گیتی آرا بیگم حصولِ تعلیم کے زمانے میں کالج سے رخصت لے کر گھر جاتی ہے تو اس کے والد جہانگیر مرزا کے دوست اپنے جگری دوست کی وفات کی اندوہ ناک خبر سن کر افسردگی کی شدید کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کو بہت دکھ بھرے انداز میں یوں یاد کرنے لگتےہیں کہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خونی رشتوں سے ہٹ کر بھی کچھ ایسے رشتے ہوتے ہیں جن کے خلوص کی سچائی انسان اپنے خون میں تمام عمر محسوس کرتا رہتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو ان یادوں کے حصار سے چھٹکارہ پانے کا اہل ثابت نہیں کر سکتا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یادوں کا یہ حصار مزید مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے گویا ایسی یادیں مستقل طور پر انسانی لاشعور کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں اور اس کی زندگی کو نئی معنویت عطا کر دیتی ہیں:

''بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ وقت کی زد میں نہیں آتے۔ میرا اور جہانگیر کا رشتہ بھی ایسا ہی تھا------ چچا جی کی آواز اچانک ہی گھٹ گئی تھی۔ یہ بچپن کے ساتھی مرتے ہیں تو یوں لگتا ہے بچپن ختم ہو گیا۔ پھر وہ اپنی مخصوص پر سکون آواز میں اپنی اور جہانگیر مرزا کی اکٹھی کی ہوئی شرارتوں کا ذکر کرتے رہے۔ اور پھر وقت نے اس کے اندھیرے راستے الگ کر دئیے اور وہ تو ہونے ہی تھے مگر ہمارے دل الگ نہیں ہوئے۔''(۱۵)

صفدر لیوچو لڑکپن ہی کے زمانے میں اپنے گھر کےخراب معاشی حالات کے پیش نظر اپنے وطن سے دور آکر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔یوں اس کی کالج کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی تھی جس کی کسک ہمیشہ اس کے دل میں رہی۔اس کو اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکنے کا شدید دکھ تھا ۔کبھی کبھی اس احساس کی شدت بڑھ جاتی تو وہ شدید ماضی گیریت کا شکار ہو جاتا ۔ایسے میں اپنے کالج کے درودیوار اور اپنے ہم جولیوں کو یاد کرتے ہوئے اداسی کی ایک گہری پرچھائیں اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی اور وہ تادیر اس کے حصار سے نکلنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتا تھا:

''اس نے حسرت سے پیکنگ کالج کے ان درودیوار کو یاد کیا۔ جس میں مشکل سے وہ اپنی زندگی کا ڈیڑھ سال گزار پایا تھا۔ کالج کے کمروں ، برآمدوں اور میدان میں اب بھی اپنے مخصوص یونیفارم میں بے شمار بے فکر اور ہنستے لڑکے کتابیں اور نوٹ بکس بغلوں میں دبائے گھوم رہے ہوں گے۔ کھیل کے میدان میں جمناسٹک کے کرتب اور مختلف کھیلوں کے گر سیکھ رہے ہوں گے اور ہر سال تقسیم اسناد کے وقت سیاہ گاؤن پہن کر بے شمار طالب علم ڈگریاں ہاتھوں میں لیے بکھر جائیں گے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئے گا کہ ایک دن کالج کی اس چار دیواری سے صفدر لیوچو نام کا کوئی لڑکا بہ حسرت ویاس فارغ التحصیل ہوئے بغیر نکل گیا تھا تاکہ وہ اپنے ماں باپ ، بھائی بہنوں اور کئی رشتہ داروں کی ذمہ داری سنبھال سکے۔''(۱۶)

لیوچو کی مانند دیگر بہت سے اس کے ہم وطن بھی روزی کی تلاش میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔انہی چینی باشندوں میں مارگریٹ نامی ایک لڑکی بھی تھی ۔ اس لڑکی سےصفدر لیو چو کی ملاقات لی خان کے توسط سےہوئی تھی۔ مارگریٹ بھی اجنبی دیس میں تنہائی کا شکار تھی اور اپنے وطن کی یادوں میں ہر وقت کھوئی رہتی تھی۔صفدر کی ذات کی صورت میں اسے گویا اپنے دکھ درد بانٹنے کا ایک ٹھکانہ مل گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کرداروں کا دکھ مشترکہ تھا یوں ایک دوسرے کے احساسات کے ادراک میں کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا:

''اس اجنبی دیس میں وہ بھی اس کی طرح تنہا اور بے گھر تھا۔ اور وہ تھا بھی بڑا حلیم ہنس مکھ اور خاموش۔ اس کے ملنے کے بعد مارگریٹ کو اس بے کراں اور اتھاہ تنہائی کا احساس نہ رہا تھا---------- اور وہ تو اس کے شہر پیکنگ سے دور جنوب کے رہنے والی تھی۔نہر کے کنارے پر اس کا قصبہ تھا جہاں بارشیں بکثرت ہوتی تھیں ۔ مگر یہ فاصلے زبان ،تمدن کے چھوٹے موٹے اختلاف تو وطن میں رہ کرمانے جاتے ہیں اور جب لوگ وطن سے دور ہوتے ہیں تو مذہب جیسا عظیم اور مسلمہ فرق بھی باطل ہو جاتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو صفدر مسلمان تھا اور مارگریٹ عیسائی پھر بھی کتنا یگانہ اور اپنا سا معلوم ہوتا ہے۔''(۱۷)

صفدر اور مارگریٹ دونوں میں مذہب کے فرق کےباوجود ایک یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ صفدر مسلمان تھا جب کہ مارگریٹ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھی لیکن چونکہ دونوں ہم وطن تھے اور وطن سے دوری بھی دونوں میں قدر مشترک تھی۔یہی اشتراک ان کی آپس میں قربت کا سبب بن گیا تھا۔وہ اکثر اپنے وطن کی خوش کن یادوں میں کھوئے رہتے تھے:

''سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے کہا مارگریٹ ! تمہیں معلوم ہے۔ تمہارے آنے سے ذرا دیر پہلےمیں کیا گنگنا رہا تھا؟ تم ہی بتاؤ۔ مارگریٹ نے اس کی طرف دیکھا ۔

بادام کے درخت

ٹھنڈے میٹھے چشمے سار کے کنارے جھوم رہے تھے۔ مارگریٹ نے دوسرا بند پڑھا اور پہلا بندادھورا ہی رہ گیا۔ نچلی جھیل سے سنگھاڑے توڑنے کے لیے جاتی ہوئی لڑکیاں خوشی میں مگن عہد قدیم کے گیت گائے چلی جا رہی ہیں۔اور کشتیاں کھیتا ہوا مسرور شادمان ہجوم قہقہے لگا رہا ہے۔ وہ خاموش ہو گئی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ یہ سب باتیں وطن سے تعلق رکھتی ہیں۔

پھر صفدر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر کہا۔

مگر تم نے آخری شعر چھوڑ دیا ۔ وہ میں مکمل کیے دیتا ہوں۔

لیکن میرا دھیان اپنے دیس کی طرف ہے۔

اے کاش ! میں وہاں جا سکتا ۔''(۱۸)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کے لیے ماضی کی یادوں سے پیچھا چھڑانا اس قدر آسان اور سہل وظیفہ نہیں ہے۔ماضی گیریت یا ناسٹیلجیا کی متذکرہ کیفیت کوئی غیر صحت مند رویہ بھی نہیں ۔انسان جب بھی حال کی تلخیوں اور مستقبل کے اندیشوں سے گھبرا اٹھتا ہے تو عین فطری انداز میں ذہنی و روحانی طور پر ا پنے ماضی کی طرف مراجعت کرتا ہے۔یہ انسانی نفسیات کا وہ خاصہ ہے جس کے تحت وہ اپنے باطن میں ایک نئی تقویت محسوس کرتا ہے اور زندگی کی سطح پر ایک نئی معنویت سے آشنا ہوتا ہے۔زندگی کی یہ تازہ معنویت اسے حال کی کج ادائیوں اور مستقبل کے خوف کا زیادہ بہتر انداز میں سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔الطاف فاطمہ کے ناول " دستک نہ دو " کے لگ بھگ تمام کرداروں میں ناسٹیلجیا کی مختلف صورتوں کا اظہار بہت کامیابی کے ساتھ صحت مندانہ انداز میں ہوا ہے۔ ناول نگار نے اپنے کرداروں میں ایسی کیفیات دکھاتے ہوئے ایک ماہر نفسیات کی طرح تمام تر نفسیاتی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو پیش نظر رکھا ہے یوں وہ اپنے اس ناول میں پختہ نفسیاتی شعور رکھنے والی ایک ایسی ناول نگار کے طور پر سامنے آتی ہیں جو انسانی نفسیات کی باریکیوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان کے اظہار کا سلیقہ بھی رکھتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ علی عباس جلال پوری، **عام فکری مغالطے**، لاہور:تخلیقات ، اجالا پرنٹرز ،۱۹۷۵،ص ۴۲
۲۔ الطاف فاطمہ، **دستک نہ دو**،کراچی : فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۲، ص ۱۱
۳۔ ایضاً، ص ۱۲
۴۔ ایضاً، ص ۲۳ ۔۲۴
۵۔ ایضاً، ص ۳۲
۶۔ ایضاً، ص ۹۱
۷۔ ایضاً، ص ۱۴۸
۸۔ ایضاً، ص ۱۸۷
۹۔ ایضاً، ص ۱۸۸
۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۶
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۷
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۶
۱۳۔ ایضاً، ص ۳۲۲
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۵۰۔ ۳۵۱
۱۵۔ ایضاً، ص ۵۱۵
۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵۰
۱۷۔ ایضاً، ص ۵۸۱۔ ۵۸۲
۱۸۔ ایضاً، ص ۶۶۴۔ ۶۶۵